

## نسیم لیہ کے سوانحی نقوش: ایک تحقیقی مطالعہ

بشری قریشی ☆

### Abstract

Naseem-e-Layyah belonged to a far off city of Punjab Layyah. Naseem boasts of a plenty of poetical and literary dimensions. Along with Ghazal, Nazm, Masnavi and Marsia, genres such as literary Essay-Writing, Column-Writing, Translations, Dohra and Kafi seem to have become his identity. The present study deals with the critical as well as research and context-oriented aspects of Naseem's life and work.

نسیم لیہ کا شمار پاکستان کے مشہور اور قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ آپ کے دادا مولوی محمد صدیق اور والد مولانا غلام نبی اپنے عہد کے مشہور عالم دین تھے۔ پروفیسر مہر اختر کے بقول نسیم لیہ کا خاندان ان کے خاندان کے ساتھ یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔ ان کے بزرگ نسیم لیہ کے دادا کے بھائی مولوی نور محمد کو لدھانہ تھل سے لائے تھے اور یہاں مسجد قدیمیاں میں بٹھایا تھا۔ (۱) چنانچہ نسیم لیہ نے ایک دینی اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے دادا مولوی صدیق اور والد مولوی غلام نبی مشہور عالم دین تھے۔ ان کے والد بزرگوار حکمت کا علم بھی جانتے تھے، صاحب کرامت بزرگ اور مفتی وقت تھے۔ چنانچہ اسلام سے رغبت نسیم لیہ کی تربیت کا حصہ تھی۔ برکت اعوان اپنے مضمون یادوں کے گلاب میں لکھتے ہیں:

”میرے باجی بتایا کرتے تھے کہ مولانا غلام نبی جیسا خوش الحان اور شعلہ بیان مقرر

تھل کے پورے علاقے میں کوئی نہ تھا۔ خدا نے انھیں لحن داؤدی بخشا ہوا تھا اور وہ جب قرآن قرأت سے پڑھتے تھے تو جہاں جہاں تک آواز جاتی تھی، پورا ماحول رک سا جاتا تھا اور یہی صفات حضرت نسیمؑ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔“ (۲)

مولانا غلام نبی کے چچا مولانا نور محمد ایک عالم فاضل بزرگ تھے جن کی خدا رسیدگی کا چہ چا دور دور تک تھا۔ تمام مسلمان اور ہندو ان کا یکساں احترام کرتے تھے۔ مولانا نور محمد صاحب کے بیٹے جناب محمود الرحمان نظامی جامع مسجدؑ کے خطیب اور امام تھے۔ یہ نسیمؑ کے گہرے اور بے تکلف دوست بھی تھے۔ مولانا محمود، شعر بھی کہتے تھے اور قیس نظامی تخلص کرتے تھے۔ (۳)

مولوی غلام نبی مولانا نور محمد کے جانشین تھے۔ بعد میں وہ قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے ہاں سات بچوں نے جنم لیا۔ سب سے بڑی بیٹی مائی غلام زہرا کی شادی مولوی عبدالحق سے ہوئی، مائی غلام سکینہ کی شادی قاضی عبدالکریم سے ہوئی جو کروڑ میں مقیم ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے قاضی محمد شفیع تھل ہسپتالؑ میں بطور ڈپنسر کام کرتے تھے۔ شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے، نرگس تخلص کرتے تھے۔ مگر افسوس کہ ان کا کلام حالات کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ دوسرے لڑکے عبداللہ کا کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا، تیسرے بیٹے قاضی احمد رفیق محکمہ فون میں ملازمت کرتے تھے۔ معروف شاعر، ادیب اور صحافی سلیم اختر ندیم انہی کے فرزند ہیں۔ مولوی غلام نبی کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی عبدالسمیع تھے جو نسیمؑ کے نام سے مشہور ہوئے اور اس ریگ زار جسے یہ کہتے ہیں، کی علمی و ادبی حوالے سے پہچان بن گئے، تاہم کلام شاعر تھے۔ قدرت نے انھیں یہ ملکہ خوب ودیعت کیا تھا۔

مولوی غلام نبی کی زوجہ ایک دین دار خاتون تھیں، وہ اپنے علاقے کی خواتین کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی تھیں اور دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتی تھیں۔ نسیمؑ نے انہی کی کود میں پرورش پائی۔ دینی گھرانے کی تربیت نے مذہب سے وابستگی اور گہرا لگاؤ پیدا کر دیا۔

قاضی عبدالسمیع بھٹہ ۳۱ اگست ۱۹۲۹ء کو اسی نیک خاتون کے لطن سے پیدا ہوئے۔ ان کی ماں نے ہی ان کا نام تجویز کیا تھا۔ وہ گھر بھر کے لاڈ لے تھے، سب کی توجہ کا مرکز بھائیوں کی آنکھ کا تارا، بہنوں کا راج دلار تھے چوں کہ وہ سب سے چھوٹے تھے، اتنے لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ ان کی

والدہ نے نسیم ایہ کی تربیت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ دینی اور ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور والدہ سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا، کوئی بھی معصوم ذہن جب اپنی پختگی کے مراحل طے کر رہا ہوتا ہے تو آس پاس کا ماحول اس بے رنگ تصویر میں رنگ بھرتا چلا جاتا ہے اور اس کی شخصیت کے مکان کی تعمیر کی اینٹ پر اینٹ رکھتا چلا جاتا ہے۔ سوان کی شخصیت کی تعمیر دینی خطوط پر ہونے لگی۔ والد عربی، فارسی اور سریانی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ تینوں زبانوں کا علم بھی انھیں ورثے میں ملا۔ رانا اعجاز احمد کہتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے عالم بھی تھے اور عربی، فارسی، اردو اور سریانی پر عبور رکھتے تھے۔ وہ بہت نفیس اردو بولتے تھے۔ (۴)

ادب سے محبت اور لگاؤ انھیں اپنے بھائی کی وجہ سے ہوا۔ وہ محمد شفیع زرگیس کے لاڈلے تھے، انہی کی صحبت میں رہ کر انہوں نے ادب سے آشنائی حاصل کی۔ مولوی غلام نبی فن خطاطی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ یہ علم انہوں نے عبدالسمیع کو بھی منتقل کیا، انھیں حکمت کی بھی شہد تھی۔ وہ ابھی لڑکپن میں تھے جب ان کے بھائی محمد شفیع انتقال کر گئے۔ یہ جانکاہ صدمہ مولوی غلام نبی کے لیے روگ بن گیا۔ بیٹے کی موت نے انھیں ہلا کر رکھ دیا۔ لحن داؤدی رکھنے والے غلام نبی کی آواز میں پہلے جیسا لوج اور بحیثیت واعظ وہ گھن گرج باقی نہ رہی۔ یہ صدمہ آہستہ آہستہ دل کا ما سور بن گیا، وہ بیمار رہنے لگے اور یہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی۔ ابھی نسیم ایہ کم سن تھے جب ان کی ساری ذمہ داری ان کے بھائی قاضی احمد رفیع اور والدہ پر آ گئی۔ والدہ ایک سمجھدار خاتون تھیں، دینی تعلیم گھر دینے کے ساتھ ساتھ انھیں مختلف مدارس میں بھی بھیجتی رہیں۔ اسی دوران وہ میانوالی کے ایک مدرسے میں بھی تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے جہاں مولانا کوثر نیازی بھی ان کے ہم درس رہے۔ مولانا کوثر نیازی کے وزیر بننے پر وہ یہ بات بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتایا کرتے تھے۔ (۵)

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول ایہ میں داخلہ لیا جہاں کوئی چند ماہ تک، ریاض انور اور مشکور خان جیسی شخصیات ان کی ہم جماعت تھیں۔ یہ تقسیم پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ نسیم ایہ ان دنوں چھٹی جماعت میں تھے۔ وہ نامساعد حالات کے باعث اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، انہوں نے نسیم ایہ جماعت میں تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ خود کو ”مد لچی“ کہا کرتے تھے۔

”صحرائے تھل میں شاعری کے ولی دکنی حضرت نسیم ایہ نے عربی، فارسی کی تعلیم کے بعد ایک سکول میں حسب ضابطہ داخلہ لے کر مڈل کی سند بھی حاصل کر لی تھی اور وہ اکثر دوستوں کی محفل میں خود کو ”مڈ لچی“ کہا کرتے تھے۔ دنیا بھر کے علوم کا مطالعہ رکھنے والے علامہ نسیم ایہ نے اپنے روزگار کے لیے پٹوار میں داخلہ بھی لیا تھا۔“ (۶)

حصول روزگار کے لیے انھوں نے کئی محکموں میں قسمت آزمائی کی۔ ایک سال تک بطور پٹواری کام کیا، ڈیڑھ سال تک کروڑ لعل عیسن میں تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے، کچھ عرصہ بھکر TDA میں بطور کلرک کام کیا۔ بالآخر ۱۹۶۵ء میں انھوں نے بلدیہ کی لائبریری میں بطور لائبریرین کام شروع کر دیا اور باقی عمر وہیں گزار دی۔ یہ ملازمت بھی معاشی طور پر انھیں مستحکم نہ کر سکی۔ اتنی صلاحیتیں اور خوبیاں رکھنے والا شخص ساری عمر بہتر ذریعہ معاش کے لیے بھٹکتا ہی رہا۔ اسی لیے وہ خود کہتے ہیں:

کب سے افلاس کے تالطم میں لاش کی طرح بہہ رہا ہوں میں  
باوجود اس کے میری ہمت دیکھ تجھ کو رزاق کہہ رہا ہوں میں (۷)

ستم ظریفی ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کو پنشن بھی نہ ملی۔ کیوں کہ دوست نوازی انھیں بہت مہنگی پڑی۔ ان کے جو دوست لائبریری میں آتے تھے اور واپسی پر کتاب لے جاتے تھے وہ کبھی واپس نہیں کرتے تھے اور کتاب کی واپسی نسیم ایہ جیسے با مروت شخص کے لیے خواب بن کر رہ جاتی۔ ریٹائرمنٹ کے وقت چارج مکمل نہ دینے کی وجہ سے ان کو مکمل گریجویٹی بھی نہ مل سکی۔ یعنی ساری عمر کی ملازمت کا حاصل دوست احباب کی نذر رہ گیا۔ لیاقت علی نیازی کے علاوہ کوئی دوست بھی خبر گیری کو نہ آیا اور انھوں نے ہی ان کے اہل خانہ کی مالی معاونت کی۔ بعد ازاں نسیم ایہ کی بیوی نے اپنی سب سے بڑی بیٹی ثمرینہ جمال کی شادی ان سے کر دی جس نے اس بے آسرا خاندان کو نہ صرف تحفظ فراہم کیا بلکہ ان کی تعلیم اور ضروریات کا بھی مکمل خیال رکھا۔ اس ذمہ داری کا بوجھ شاید لیاقت علی خان نیازی کو نہ اٹھانا پڑتا۔ اگر نسیم ایہ کی کوئی زینہ اولاد گھر والوں کے لیے روزگار کا سبب ہوتی۔ ان کے دوستوں کے خیال میں انھوں نے ایک مشکل زندگی بسر کی اور شاید یہی وجہ ہے کہ مناسب روزگار دستیاب نہ ہونے کے باعث انھوں نے بہت دیر سے شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ ۱۵ جون ۱۹۶۹ء

میں ان کی شادی اپنے چچا زاد بھائی کی بیٹی زیتون سے ہوئی، وہ اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت رکھتے تھے۔ (۸)، ان کے بھتیجے سلیم اختر ندیم کے مطابق:

”وہ ان سے بیس برس چھوٹی تھی اور وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔“ (۹)

شادی کے بعد وہ دوستوں کی محفل میں اکثر کہا کرتے تھے کہ آج سے نسیم ختم اور زیتون آگئی۔ اپنی بیوی سے محبت کے اظہار کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی لکھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اے مری زیتون، اے آئینہ دارِ برقی طور      سیم رخ، اے سیم و ش، اے سیم کون، اے سیم تن  
عطر سامان، گل نما، بلبل نوا، غنچہ دہن      شمعِ خانہ، رونقِ بزمِ غزل، صبحِ چمن  
اے مری زیتون، اے آئینہ دارِ برقی طور      اے چراغِ خلوتِ مریمِ بیاضِ رنگ و نور (۱۰)

زیتون کے لطن سے ان کے پانچ بچے ہوئے۔ بڑی لڑکی ثمرینہ جمال ثمر ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء میں پیدا ہوئی۔ ثمر کو اپنے والد کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ادبی ذوق اسے ورثے میں ملا۔ بچپن سے ہی وہ بچوں کے مختلف رسائل میں کہانیاں لکھتی رہی۔ اس نے ایم اے اسلامیات کیا اور اب وہ لیاقت علی نیازی کی بیوی ہیں۔ ان کی دوسری بیٹی فرحینہ کمال ۷ جولائی ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوئی، اس نے ایم اے اُردو کیا ہے۔ ان کی تیسری بیٹی آئینہ مثال ہے جو ۱۹۸۳ء میں پیدا ہوئی، وہ پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں اور اردو ادب کی طالبہ رہی ہیں۔ نسیم ایہ ایٹا مشکور حسین ۱۹۸۴ء میں پیدا ہوا، گریجویٹیشن کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں مصروف ہے۔ فیصل منشور ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے جو ۱۹۸۷ء میں پیدا ہوا اور والد کی وفات کے وقت سن شعور تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے بہت لگاؤ رکھتے تھے، ان کی زوجہ کہتی ہیں:

”انھوں نے بیس سال کی بھرپور ازدواجی زندگی بسر کی۔ بچوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے، گھر سے باہر جو چیز کھاتے تھے وہ اپنے بچوں کے لیے ضرور لے جاتے۔ کہتے تھے کہ اگر نہ لے کر آؤں تو ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، لوگوں کا

خیال تھا کہ نسیم اپنے بیوی بچوں کے پیچھے پاگل ہیں۔ (۱۱)

نسیم ایہ کا سب سے چھوٹا بیٹا فیصل منشور ابھی ڈھائی سال کا تھا جب مشیت ایزدی پر لبیک

کہتے ہوئے وہ انھیں اس بے رحم دنیا کے تھپیڑوں کے حوالے کر کے اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ ان جیسے نابغہ روزگار لوگوں کی موت کبھی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے فن کے ذریعے زندہ رہتے ہیں، ان کی تخلیقات انھیں ہمیشہ ادب کے حوالے سے کیے گئے تذکروں میں ابدی حیات بخشی ہیں۔

اپنی زندگی میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے نسیم ایہ نے بتایا کہ ان کی تخلیقی زندگی کا آغاز ۱۹۴۴ء سے ہوتا ہے تاہم جعفر بلوچ کے مطابق: ”انھوں نے باقاعدہ شعر کوئی ۱۹۴۷ء سے شروع کی۔“ (۱۲) نسیم ایہ نے جب پٹواری میں داخلہ لیا تو اہل انصاف مشہدی جو شکستہ مشہدی تخلص کرتے تھے، ان سے ان کی ملاقات ہوئی۔ شکستہ مشہدی اس وقت قانون کو تھے۔ نسیم کے اندر شاعری سے پہچان کے بیچ ان کے بھائی محمد شفیع زنگس اپنی شاعری کے ذریعے بوجھے تھے۔ شکستہ مشہدی کی رفاقت میں یہ بیچ پینے لگ گیا۔ چنانچہ انھوں نے ابتداء میں شفیع عاصی اور شکستہ مشہدی سے اصلاح لیما شروع کر دی۔ لیکن وہ باقاعدہ شاگرد فرمان پٹیلوی کے ہوئے۔ کوئی چند ماہ رنگ، ریاض انور، مشکور خان اور نسیم ایہ کی زمانہ طالب علمی کی سنگت اور اردو کے استاد مرید حسین کی رہنمائی بالآخر قاضی عبدالسمیع کو شاعری کے دشت بیکراں تک لے آئی۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۴۸ء میں ہفت روزہ ”نظام جدید“ لاہور میں شائع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس آتش نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا اور انھیں شاعر شباب نسیم ایہ بنا دیا۔ بعد میں یہ باد نسیم، ایہ کا تعارف بن گئی جس کے متعلق طارق عزیز شو میں سوال کیا گیا کہ ایسا کون سا شاعر ہے جس کا نام صرف لفافے پر لکھ دیں تو خط اسے مل جاتا ہے۔ برکت اعوان اپنی یادداشتوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں

”میں ایک دفعہ مری گیا، وہاں مرا بھائی مقیم تھا۔ وہاں بھائی کی گھر پر غیر موجودگی کی صورت میں ایک دکان سے سودا لینے گیا تو وہاں میری ایک آدمی سے ملاقات ہوئی اور باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ میں نے کہا ایہ سے۔ اس نے پر جوش انداز میں مجھ سے کہا اچھا نسیم ایہ کے شہر سے آپ کا تعلق ہے۔ پھر وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا اور صبح آٹھ بجے سے ۱۲ بجے دن تک محض نسیم ایہ کی وجہ سے میری مہمان داری کی۔ (۱۳)

یہ کے فن کی بلندی کا سبب ان کی شاعری کا نیا رنگ اور نیا آہنگ ہے۔ یہ دلکش اسلوب تحریر قدرت کے ودیعت کردہ شاعری کے ملکہ کے ساتھ ساتھ ان کے وسیع مطالعہ کے سبب تھا۔ اسی لیے وہ سب کچھ چھوڑ کر شاعری ہی کے ہو رہے۔ اس تخلیقی محاذ پر انھیں بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ ڈوبتی اخلاقی قدریں ان کی حساس شاعرانہ طبیعت پر کسی بارگراں سے کم نہ تھیں۔ اس لیے انھوں نے بہانگہ دہل معاشرتی استحصال اور ظلم و جبر کے خلاف بھی لکھا اور زمانے کی ناقد رشناسی کا گلہ بھی کیا۔ دنیا کی سرد مہری کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری میں بڑے کرب سے کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

مرے حسین خداؤ میں، ایک شاعر ہوں      مری ہنسی نہ اڑاؤ میں، ایک شاعر ہوں  
 اگر کسی نے فریب وفا دیا تم کو !!      تو میرے ساتھ بھاؤ میں، ایک شاعر ہوں  
 مری حیات کی رونق تو میکدوں سے ہے      مجھے حرم سے بچاؤ میں، ایک شاعر ہوں (۱۴)

زمانے کی بدلتی ہوئی روش کے ساتھ ساتھ نسیم یہ کی شاعری کا آہنگ و انداز بھی بدلتا رہا۔ اسی بات نے ان کی شاعری کو زندہ رکھا اور آنے والی کئی صدیوں تک ادب کا قاری ان کے افکار و نگارشات سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔ بدلتے ہوئے حالات کے دھارے نے ان کی سوچ کے دھارے بھی بدلے اور امتدادِ زمانہ نے ان کی فکر اور اسلوب بیان پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔

اردو، عربی، فارسی اور سرائیکی زبان پر عبور نے ان کے کلام کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات اور تلمیحات نے ان کی شاعری کے گلستان کو مہکا دیا۔ ان کی علم دوستی سے تو کسی کو انکا نہیں۔ اسی غلیبت کے سبب انھوں نے یہ کے نوعمر اذہان کو ادب جیسی تعمیر اور تخلیقی سرگرمیوں میں لگا دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین، پروفیسر مہر اختر وہاب، شعیب جاذب، پروفیسر جعفر بلوچ اور ان جیسی لاتعداد ادب کی قد آور شخصیات نے ان سے کسب فیض کیا۔

نسیم یہ نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ نظم، غزل، قطعہ اور اردو منظوم تراجم بھی خوب کیے۔ لیکن ان کا اصل میدان غزل تھا جو متنوع موضوعات کا مجموعہ ہے۔ نئی اور منفرد تراکیب کو بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ استعمال کیا۔ ان کی غزلیات حسن و عشق سے لے کر سیاسی سماجی اور معاشی موضوعات سے مزین ہیں۔ معاشی نا آسودگی، وسائل کی کمی، احباب کی بیگانگی اور لاتعداد مسائل

کے باوجود ریگزار تھل کے اس ”تھلوچر“ نے اپنے علاقے کی نمائندگی کی۔ اسی لیے یہ ان کے نام کا حصہ بن گیا اور اس گمنام شہر کا نام اور مقام انھوں نے بلند کر دیا۔

نسیم یہ خوش گلو تھے، اسی لیے جب مشاعرے میں ترنم کے ساتھ کلام پڑھتے تو لوگ جھوم اٹھتے تھے۔ مشاعرے میں ان کے بعد لوگ کسی اور کو توجہ سے نہ سنتے تھے۔ پروفیسر جعفر بلوچ لکھتے ہیں:

”انھوں نے ۱۹۴۵ء میں اقبال کے رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ عبدالمجید عدم کے تتبع میں لکھتے رہے۔ ”حسینیت“ کے حوالے سے جوش کی تقلید بھی کی۔ دامن یوسف میں حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کے آہنگ و لہذا کو بھی اپنایا۔ (۱۵)

ان کی شاعری کے پہلے دور کی تصانیف حیات نامہ جناح اور تعمیر خودی ہیں۔ اسی دور میں انھوں نے فرمان پیڈیا لوی سے بھی اصلاح لی۔ یہ دور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کا ہے۔ اب ان کی یہ دونوں تصانیف دستیاب نہیں۔ شاعری کے دوسرے دور میں انھوں نے عبدالمجید عدم کا رنگ تغزل اختیار کیا۔ اس دور میں عدم کی زمینوں میں انھوں نے کئی غزلیں کہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ”تخت بلقیس“ اسی دور کی تصنیف ہے جو بعد ازاں ”برگ لریزاں“ کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء میں دینی تعلیمات خریاتی احساس کو بادی تھی ہیں اس دور میں وہ ”دامن یوسف“ اور ”صبح بقا“ تخلیق کرتے ہیں۔ آخری دور میں ان کی سرائیکی شاعری نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی کتاب ”وکھرے ڈکھ حسین دے“ اسی عہد کی تخلیق ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی غزلیات کا مجموعہ ”برگ لریزاں“ شائع ہوا جو ان کی شاعری کے حوالے سے ان کی نمائندہ کتاب ہے۔ اس سے قبل انھوں نے اقبال کی چند غزلیات اور کچھ نظموں کا سرائیکی زبان میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ وہ فی البدیہہ شاعری کے امام کہے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے راقم سے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا:

”نسیم صاحب کو شعر کہنے کا ہنر آتا تھا۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی کی عمدہ اور قابلِ داد صورتیں ملتی ہیں۔ اپنے سینئر معاصرین میں انھوں نے کہیں کہیں جوش ملیح آبادی اور عدم سے استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً ان کے قطعات پر عدم کے اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کے منظوم تراجم بھی ان کی قدرتِ کلام کے شاہد ہیں۔“ (۱۶)



نسیم کے کلام میں ایک خاص ماحول کا بیان بھی ہے۔ ماحول، حالات اور خاندانی پس منظر کے حوالے سے انہوں نے اپنی علمی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ان کا تعارف اس بات کی گواہی ہے کہ انہوں نے اپنے علمی ورثے کی نگہبانی کا فریضہ اپنے ذمہ لیا تھا اور اسے سنبھالنے کی کماحقہ کوشش بھی کی۔ ان کی بیاض کا ایک ورق ملاحظہ کیجئے:

میں / اپنے جدِ امجد

قبلہ طریقت / حضرت گرامی مولانا نور محمد صاحب ولیؒ دوراں کا وہ گمنام پوتا ہوں

جس کو نون کار / شاعر شباب نسیم یہ

جس کو علما / مولوی نسیم

جس کو مصنفین / مصنف دامن یوسف

جس کو سوسائٹی / نیم منطقی و نیم فلسفی

جس کو مدرسین اسلام / بے کراں عناصر و محبت

جس کو نعت خواں / خوش گلو، نعت کو

اور جس کو عوام / ایک اچھا شاعر سمجھتے ہیں

لیکن اتنی پر اسرار آوازوں کے ہوتے ہوئے میری یہ آواز کون سنے گا؟

سب کچھ ہو کر بھی میں کچھ نہیں ہوں / مجھے

علامہ حضرت مولانا غلام نبی صاحب / اپنے عالم باپ نے

اس لیے جنا ہے کہ میں ان کی جاگیر علم برباد نہ ہونے دوں

اگر اس متاع گراں قیمت کو

میں نے کسی مصرف بے جا کی بھینٹ چڑھایا تو تمہیں ہر طرح

کا حق حاصل ہے کہ آج / مجھے میرے سامنے ماخلف کہہ دو..... وگرنہ

کل قیامت کے روز / یاد اور محشر!

میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ

میں تو بازار کے ہر صراف / کے پاس اپنا سونا لیے لیے پھر لیکن کسی نے پرکھنے کی

زحمت / گوارا نہ کی۔ (۱۷)

شاعری کے علاوہ نسیم یہ راگ راگنیوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ مولوی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود انھیں موسیقی سے بھی شغف تھا۔ وہ گھر والوں سے چھپ کر باقاعدہ موسیقی سیکھتے رہتے تھے۔ بقول برکت اعوان:

”وہ برصغیر کی ایک مشہور مغنیہ جو تقسیم کے بعد یہ آ کر آباد ہوئی تھی، کے پاس جاتے تھے۔ وہ باقاعدہ ان سے فرمائش کر کے راگ سنا کرتی تھی۔ (۱۸)

اسی طرح پروفیسر مہر اختر وہاب بھی بتاتے ہیں:

”۸۳-۱۹۸۲ء کی بات ہے کہ میں نسیمؑ کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ انھوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ کبھی تہذیب اور ثقافت کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے ایک خاتون کا تذکرہ کیا کہ وہ ان سے ہارمونیم سیکھنے جاتے تھے۔ موسیقی کے شوق میں انھوں نے ایک مغنیہ/گانیکہ اور رقاصہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ (۱۹)

ان کی مندرجہ ذیل غزل جو اپریل ۱۹۸۹ء میں روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئی، ان کی راگ اور موسیقی سے نسبت اور گاؤ کا کھلا اظہار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

مرے دیار، مرے شہر، مری گلیوں کو	کو الیا بناؤ، غزل کا موسم ہے
اس ایک شرط پہ چھیڑے ہیں ساز خسرو نے	کہ ”راگ ٹھاٹھ“ کے گاؤ غزل کا موسم ہے
کدرا چھیڑ دیا کس نے چاندنی شب میں	دلوں کے ساز بجاؤ غزل کا موسم ہے
وہ راگ چھیڑو کہ اقبال بانو یاد آئے	غزل قتیل کی گاؤ غزل کا موسم ہے
تماشا دیکھیں گے ہم آنسوؤں کی رم جھم کا	ملہار جھوم کے گاؤ غزل کا موسم ہے
نضا میں کوچی ہے دربار اکبری کی صدا	کہ تان سین کو لاؤ غزل کا موسم ہے
غزل کے ساز پہ ”ملتان“ کر کی لے چھیڑو	وہ ”پیلوں پکیاں نی“ گاؤ غزل کا موسم ہے
وہ شخص نیند سے کلیان کو جگا دے گا	پنھانے خاں کو بلاؤ غزل کا موسم ہے
نسیم روح کی تاریں بھی جھنجھنا انھیں	ذرا ستار بجاؤ غزل کا موسم ہے (۲۰)

کہا جاتا ہے کہ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ یہ فیصلہ دیتا ہے کہ کس نے اپنے فن کے بل بوتے پر زندہ رہنا ہے اور کون بعد از مرگ کتاب کے اوراق میں دن کر دیا جائے گا۔ نسیم ایہ کے شاعرانہ افکار کو وقت نے اپنے دوش بدوش زندہ رکھا ہے۔ بقول ڈاکٹر خیال امر وہوی:

”وہ نہایت سادہ اور گہری فکر کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔“ (۲۱)

اس گہری فکر کی بنیاد پر وہ بہت جلد استاد الا سا تذہ کہلانے لگے۔ ایسا انسان جو حالات اور وقت کے دباؤ کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے مفلسی کے پے در پے وار سہتا رہے لیکن اپنی حیات کی حفاظت اور اپنی فکر کو بلند اور اپنے سچے جذبوں کی پاسداری کرتا رہے۔ یقیناً وہ بڑے کردار کا آدمی ہے۔ ان کی بیوی کے بقول:

”وہ انسان دوست اور انسانیت سے محبت کرنے والے تھے۔ جہالت سے سخت

نفرت کرتے تھے ان کے افکار کے سارے پر تو ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں

کیوں کہ شاعری ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ غربت کے باوجود ہر دل عزیز اور سخی

تھے۔ مہمان نوازی بھی ان کی شخصیت کا وصف تھی۔“ (۲۲)

ان کی شاعری میں ایک مخصوص تہذیبی رچاؤ نظر آتا ہے۔ اگرچہ ان کی مادری زبان سرائیکی تھی لیکن تہذیبی حوالے سے لکھنوی طرزِ بیان اور طرزِ انداز اختیار کیے رکھتے تھے۔ یادوں کے گلاب میں برکت احوال نسیم ایہ سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”میں مزدوری کے سلسلے میں راولپنڈی جا رہا تھا۔ میں مسافرت اور غریب الوطنی کے دن کاٹ رہا تھا۔ کہیں کہیں ایک دو دن مزدوری مل جاتی تو دو دن شکم پر پی کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا وگرنہ بے روزگاری کا مسلسل کرب طاری رہتا تھا۔ ایک دن پہلے مزدوری سے بچے ہوئے پیسوں سے میں نے کھانا کھلایا اور نکت بھی لیا تھا۔ لیکن اب دو وقت سے پیٹ خالی تھا۔ نقاہت سے مجھے بار بار اونگھ آ رہی تھی، گاڑی کو کہیں جھکا لگنے سے آنکھ کھول کے ڈبے کو دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ گرم لو کے تھیڑے اور ڈبے میں گھس آنے والا گردوغبار جسم کو جالائے جا رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ایک درد بھری آواز پڑی جو کچھ اس طرح سے تھی۔

”رائنخن چھیڑ سویلے منھیاں تے چٹی ہیر کوں مال رلائی جل، منت لائی جل۔“

گانے والا بھیرو کے سروں میں گارہا تھا کہ ”اے راینخن اٹھ اور اپنی بھینسوں کو بیلے کی طرف لے چل لیکن اے مرے محبوب میں تیری چاہنے والی ہیر ہوں، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ درد بھری آواز والے کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں بے ساختہ اٹھ کر گانے والے کے پاس چلا گیا۔ ریل کے ڈبے کی زرد روشنی والے بلب کے نیچے سرخ و سفید رنگت سیاہ داڑھی، لیس صاف، بڑی بڑی آنکھوں میں کا جل کی ڈوری، ہونٹوں پر دندا سے کی تہہ، سر پر سفید رام پوری ٹوپی بغیر بین کے لکھنوی ٹائپ کا سفید براق کرتہ، چوڑی دار سفید پاجامہ، پاؤں میں سیاہ رنگ کا سلیم شاہی جوتا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ لکھنوکا یہ آدمی سرائیکی زبان اتنی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ گارہا ہے۔ یہ تھی تھل کے شاعر شباب نابغہ عصر حضرت علامہ نسیم ایہ سے میری پہلی ملاقات۔ ریل گاڑی میں جب وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ لکھنوکے رہنے والے ہیں یا صحرائے تھل کے تھلوچی سرائیکی ہیں۔ ان کی تراش تراش اور نستعلیق اردو بولنے کا انداز مجھے ورطہ حیرت میں ڈال رہا تھا۔“ (۲۳)

دامن یوسف، صبح بقاء، تخت بلقیس (مجموعہ قطعات)، لالہ صحرا، وکھرے ڈکھ حسین دے، بال جبریل کا منظوم سرائیکی ترجمہ، نکہت گل اور برگ لریزاں ان کے شعری فن پارے ہیں۔ ان کے علاوہ بیاضوں میں موجود غیر مطبوعہ اور اخبارات میں شائع شدہ مواد الگ ہے۔ ان کے شعری مجموعے اگرچہ سرمایہ نہ ہونے کے باعث ناقص طباعت اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں ہیں جس طرح گدڑی میں لعل پوشیدہ نہیں رہ سکتے اسی طرح نسیم ایہ کی شعری اولاد ان کے تخلیق کردہ اشعار میں مخفی افکار کی خوشبو بھی چھپی نہ رہ سکی۔ ان کے شعری مجموعے برگ لریزاں کی تقریب رونمائی مختلف علاقوں میں ہوئی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو ایک تقریب لاہور کے مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی جس کا اہتمام جعفر بلوچ نے کیا۔ اس تقریب میں آسمان ادب کے درخشاں تاروں نے شرکت کی جس کی صدارت جناب عطاء الحق تاسمی نے فرمائی، جس میں پروفیسر جعفر بلوچ نے ان کی شخصیت کے حوالے سے بات کی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے برگ لریزاں کو غزل کے ایک منفرد لہجے کا حامل مجموعہ قرار دیا ہے۔ پروفیسر فضل آرش نے نسیم ایہ کے فن اور فکر پر بحث کی۔ شعیب جاذب نسیم کے خاص شاگردوں میں سے تھے، انہوں نے

ان کے حسن تغزل، تلمیحات اور تشبیہات سے بحث کی۔ سلیم اختر ندیم اور گلزار محبوب نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب عطاء الحق قاسمی نے بحیثیت صدر تقریب برگ لڑاں کو ایک محبت وطن پاکستانی کی شاعری قرار دیا۔ انہوں نے ان کے قادر الکلامی اور ان کی پاکیزگی فکر کی داد دی۔ برگ لڑاں کا دیباچہ ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے کہا:

میں نے اس قریبے کوچن شاعروں کی خوشبو سے معمور پایا ان میں ایک نسیم یہ بھی تھے۔  
میرے لیے یہ خوشبو کا جھونکا دراصل جس غنچہ کی صدا تھا۔ میں بوئے سحر کے مست  
بلاوے پر اس سرزمین کی طرف بے اختیار کھنچا پایا گیا جس نے دھرتی اور شاعری کے  
درمیان ہر قسم کی مغائرت ختم کر دی تھی اور اب نسیم کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی.....  
نسیم نے اپنا وہ شعر سنایا جس کی کوچ عرصے سے ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

آپ اگر تخت نشیں ہیں تو بڑی بات نہیں دھول بھی اڑ کے بلندی پہ پہنچ سکتی ہے (۲۴)  
وہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے والے انسان تھے۔ وہاں کے شاعروں سے ہٹ کر ایک  
الگ دنیا آباد کی۔ یقیناً نسیم یہ کی تخلیقات زندہ رہنے والی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف شاعری بلکہ نثر کے  
میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ تحقیق اور تنقید کے حوالے سے مختلف جراند و رسائل میں ان کے کئی پر مغز  
مضامین شائع ہوئے جو یقیناً اپنی مثال آپ ہیں۔ لائبریری کی ملازمت انہیں معاشی آسودگی تو نہ دے  
سکی لیکن علم کی پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈے میٹھے پانی کا کنواں ضرور ثابت ہوئی۔ ان کی ملازمت  
کے دوران یہ میں جو ادبی ٹھکانے مشہور تھے، ایک نسیم یہ کی لائبریری اور دوسرا صابر ہوٹل جو اسٹیشن کے  
پاس واقع تھا۔ جہاں ادبی ستارے اپنی محافل سخن برپا کرتے اور ایک دوسرے کو داد دیتے اور چند لمحوں  
کے لیے سب غموں سے آزاد ہو کر ادب کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں آجاتے۔

نسیم یہ نے ایک بھر پور تخلیقی زندگی بسر کی، دوستوں کی محفلوں کی جان بھی رہے، بہت جلد  
استاد شعرا میں شمار ہونے لگے۔ ان کی صحبت بہت سے نوجوانوں کو تھل کے ریگزاروں کی تپتی دھوپ میں  
بھٹکنے کی بجائے ادب کی نزم اور سبک روشنی میں لے آئی جس سے نہ صرف ان کے کردار کی تعمیر ہوئی  
بلکہ وہ معاشرے کا بوجھ بننے کی بجائے معاشرے کے مفید رکن بن گئے۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھے

جنہیں چند ایک بشری کمزوریوں کے باوجود ایک اچھا انسان کہا جاسکتا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے انہیں حسین سراپا عطا کیا تھا۔ پر اثر بولتی آنکھیں ایسے کٹورے جن میں گلابی ڈورے تھے، کاجل جنہیں حسین تر کر دیتا تھا، پان کھاتے تھے، سفید کرتے پاجامہ زیب تن کرتے تھے۔ جناح کیپ سر کی زینت ہوتی تھی۔ آواز ایسی کہ سن لیں تو چلتے کارواں رُک جائیں، صورت دیکھیں تو بس دیکھتے ہی چلے جائیں۔ اگر کسی چیز کی کمی تھی تو بس دولت کی۔“ (۲۵)

یہ سراپا ان کی زوجہ زیتون اختر نے راقم سے ملاقات کے دوران بتایا۔ شاعر شباب نسیم ایہ کا ہفت روزہ ’بشارت‘، مظفر گڑھ ۸ جون ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں سراپا اور تعارف کچھ یوں شائع ہوا:

”مام عبدالسمیع، تخلص نسیم، وطن ایہ، عمر تیس سال، حسین و جمیل زلف دراز، چہرہ گول، رنگ گندمی، سفید بشر، متطوع ریش، وضع میں شاعرانہ رکھ رکھاؤ، بات بات میں طنز و حکمت، بلا کے حاضر دماغ و حاضر جواب، ایہ کی بے ادبیوں کے ہر وقت شکوہ سنج، سوسائٹی کے ہیرو، پورے تھل کی ناک، اردو فارسی سرائیکی (ملتان) پنجابی ہر زبان میں پختہ شعر کہتے ہیں۔ حکیم، علامہ دوران، حضرت مولانا مولوی غلام نبی، رئیس العلما کے ذہین اور مفکر خلف الرشید، والدہ محترمہ فاضلہ اور عالمہ، خاندان صاحب علم و عرفان، جد امجد حضرت نورالا ولیا مولوی نور محمد صاحب الدرجات کے پہلے اور آخری نواسے، ایہ تھل میں بیٹھ کر اٹھارہ برس سے شعر گوئی اور ان تھک پیغام دے رہے ہیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف متعدد اور مطبوعہ تصانیف دامن یوسف منظوم تفسیر سورۃ یوسف مشاعروں کے دھنی، خوددار طبیعت، پاکستان کے مشہور فنکار ایک پیارا شاعر دوسرا مولوی فکر مزاج رندانہ طبیعت قلندرانہ، ایہ میں اچھا شعری حلقہ تلامذہ،

علماء کرام میں خاصا مقام، تنقید و بحث میں انتہائی شغف!!!“ (۲۶)

نسیم ایہ کی شخصیت کے خدو خال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خیال امر وہوی لکھتے ہیں:

”مومن خان مومن کو اٹھائے اور نسیم صاحب بٹھائے۔ سڑک پر چلتے ہوئے محافل میں بیٹھے ہوئے اگر کسی شخص کو آپ معامے، مصافحے، تبسم بہ لب، ضلع جگت کرتے ہوئے دیکھیں تو سمجھئے ایک تبحر عالم اپنی کوٹھڑی کی تاریکی اور تنگی

ماحول سے گھبرا کر حقیقت شناسوں سے حظ اٹھانے کے لیے باہر نکل آیا ہے۔  
 ورنہ اگر گھر میں کشادگی صحرانہ تو نسیم کبھی برآمد نہ ہو..... نسیم صاحب کی زبان  
 دو دھاری تلوار، نگاہ ریزہ ہیں، فکر عرش مقام اور دل زخموں سے چور ملے گا۔ دنیا کے  
 ہر موضوع پر گھنٹوں بولنے میں ظہیر کا شمیری کے بعد آپ کا نمبر آتا ہے۔“ (۲۷)  
 بذلہ منجی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی، ان کی موجودگی میں محفل کشت زعفران بن جاتی تھی۔  
 ڈاکٹر مزمل حسین اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

”رمضان کے دنوں میں چائے خانہ صرف ریلوے اسٹیشن پر کھلا رہتا تھا، ہم  
 وہاں جاتے اور گھنٹوں نسیم ایہ کی زعفرانی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے۔ نسیم ایہ کی  
 شخصیت کا یہ وصف انتہائی حسین تھا کہ آپ کی محفل میں ہر مزاج کا بندہ خوش و  
 خرم رہتا اور بوریٹ اس کے پاس سے نہ گزرتی۔ وہ ہر آنے والے نئے مہمان کا  
 مزاج فوری سمجھ جاتے تھے۔ اس کے مزاج کے عین مطابق گفتگو کرتے..... نسیم  
 ایہ کو زبان و بیان پر جو قدرت حاصل تھی اس کا استعمال وہ جگت بازی میں بھی  
 خوب کرتے تھے۔ اس لیے ان کی جگتوں میں ادبیت کا رنگ ہوتا تھا۔“ (۲۸)

بذلہ منجی اور طبیعت کی شوخی کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں، اسٹیشن کے سامنے صابر ہوٹل کی  
 چھت پر اہل قلم جمع ہوتے تھے۔ ایک دن یہ اصحاب جمع تھے کہ محمود الرحمن (قیس نظامی) سرانیکی اور  
 اردو کے شاعر آتے ہوئے نظر آئے۔ نسیم ایہ نے کہا کہ ایک مصرع دیتا ہوں، شعر مکمل کر دیں۔ سب  
 نے کہا، ارشاد! انھوں نے پہلا مصرع دیا، اندر داخل ہوتے ہوئے مولوی محمود نے فوراً اس کا جواب  
 دے کر شعر مکمل کر دیا جس سے محفل کشت زعفران بن گئی۔ شعر کچھ یوں تھا:

مولوی محمود کو پھانگ میں دو تھانے میں دو بے خودی میں پھاند جاتا ہے مری دیوار کو  
 جمال پرستی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ انھیں قدرت نے حسین بنایا تھا اور حسن کو پسند کرتے  
 تھے۔ حسین چہروں کو دیکھ کر ضرور تعریف کیا کرتے تھے، اپنے مضمون یا دوں کے گلاب میں برکت  
 اعوان نے نسیم ایہ کو صحرائے تھل کا ولی دکنی قرار دیا۔ انھوں نے غزل کو شاعر کے اعتبار سے کہا ہوا تھل کی

شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہو۔ بہر حال ولی اور نسیم ایہ میں جمال پرستی کی قدر بھی مشترک ہے۔ نسیم ایہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

آ کے کل اٹختے ہیں ہونٹوں پر تبسم کے گلاب جب کبھی لیتا ہے انگڑائی ترا کافر شباب  
شہر دل کی مدبھری جو گن تجھے مرا سلام تیری آنکھوں میں گھلا ہے نشہء عمر خیام (۲۹)  
جمال دوست نسیم کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ بہت بے تکلف تھے۔ دوستی کرنا اور نبھانا جانتے تھے۔ لیاقت علی نیازی جب ایہ میں بطور A.C تعینات ہوئے تو ان کے نسیم ایہ سے گہرے مراسم اور دوستی ہو گئی۔ جب ان کا ایہ سے تبادلہ ہوا تو دوستوں کے ساتھ محبت رکھنے والا یہ شخص بہت اداس ہو گیا۔ جدائی کے خوف سے تڑپ کر بول اٹھا

ان کھلسائے گی اک عمر تیری یاد کی دھوپ چند لمحے جو ترے قرب کی چھاؤں میں رہے  
انہیں دوستوں کے دل میں جگہ بنانے کا فن بھی آتا تھا۔ یہ ان کی محبت کا ہی اثر تھا کہ لیاقت نیازی ان کی وفات کے بعد اس اجڑے ہوئے خانو اے کے لیے ذات کبریا کے بعد سائبان ثابت ہوئے۔  
نسیم ایہ کی انسان دوستی کا ہی یہ اعجاز ہے کہ ان کی بیوی بتاتی ہے کہ لوگوں نے ان کے نام کے عمرے اوا کیے، ان کی کتاب ”برگ لرزاں“ کی تقریب رونمائی مختلف شہروں میں منعقد کرائی گئیں۔  
ڈاکٹر انور سدید ان کی کتاب برگ لرزاں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”نسیم نے شاعری سے محبوبہ کی طرح پیار نہیں کیا کہ وہ نظارہ رخ و گیسو میں کھو جاتے اور جوں ہی بدن کی دھوپ ڈھلے گزری بہاروں کو یادوں کی بارات بنا ڈالے۔ نسیم نے شاعری سے فعال مردوں جیسا سلوک کیا اور اسے تیز دھار تلوار کی طرح استعمال کیا۔ چنانچہ اس کی شاعری سے جو شخصیت مرتب ہوتی ہے وہ ایک ایسے مرد صحرائی کی شخصیت ہے جو اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتا ہے اور کرگس کے جہاں میں اپنا جہان رنگ بناتا ہے۔“ (۳۰)

عصر حاضر میں نسیم ایہ ان بڑے شاعروں میں شامل کیے جاتے ہیں جن کے الفاظ کا ظننہ، معنی کا پھیلاؤ، مضامین کی ندرت، مغایم کی عظمت، اصطلاحات کا چناؤ اور شاعرانہ رکھ رکھاؤ ظلم و



زبان و بیان کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کی شاعری اگرچہ مخصوص مکتبہ فکر کی ترجمان نہیں اور غالباً وہ بھی اس کے مدعی نہیں ہیں۔ ان کی آواز ہر مکتبہ میں سنی جاسکتی ہے۔ ان کا درد علاقائی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ ان کے نظریات باوصف اختلاف حیاتِ انسانی کے مشیت زاوے کہے جاسکتے ہیں۔ (۳۱)

مندرجہ بالا اقتباس ڈاکٹر خیال امر و ہوی کی کتاب ”محا کے“ کا ایک حصہ ہے اور جہان دیگر میں احسان دانش نسیم ایشیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

”نہایت ذکی انسان ہیں، نثر اور نظم میں یکساں ہیں لیکن ان کی نظم نثر سے زیادہ اثر رکھتی ہیں اور مشاعروں میں ترنم سے وہ اس میں اور بھی جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ”پیراہن“ کے نام سے چھپی ہے جو ان کے محاسن کا آئینہ ہے۔ ابھی ان کا مجموعہ کلام نظر سے نہیں گزرا۔ (۳۲)

عطاء الحق قاسمی روزنامہ نوائے وقت کے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

”نسیم ایشیہ شاعری ہی نہیں کرتے، شاعروں کی تربیت بھی کرتے ہیں اور یوں ان کی ایک حیثیت استاد شاعر کی بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اب تک بیسیوں نوجوانوں کی شعری تربیت کی ہے جن میں جعفر بلوچ جیسے شاعر بھی شامل ہیں جو اب خود استاد شاعر ہیں۔ کو یا نسیم ایشیہ اب ماشاء اللہ استاذ الا ساتھ کے منصب پر فائز ہیں۔“ (۳۳)

معروف شاعر اور محقق جاوید احسن نے راقم کو نسیم ایشیہ کے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا:

”نسیم ایشیہ ریگ زار تھل کا عظیم شاعر اور شعلہ نوا مغنی ہے جس نے تھل کے ٹیلوں میں شاعری کی جوت جگائی اور اپنے شہر میں ترنم سے اس کی خموش نضاؤں کو نغمہ زار بنا دیا۔ نسیم ایشیہ مثنوی اور غزل میں یدِ طولی رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے شاعر تھے مگر اپنی مادری زبان سرانیکی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ خوبصورت شاعری کرنے والے پر بہار شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ملک کے ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنی پہچان کرائی بلکہ اپنے ساتھ ایشیہ کو بھی شہرت بخشی۔

ان کی غزلیہ شاعری سے چند پرتا شیر و آبدار نشتر ملاحظہ کیجئے:

گم سم تھی دو جہاں کی حقیقت مرے بغیر      میں آ گیا تو لوح و قلم بولنے لگے  
دیار مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو      ستم ظریف پیسیر خرید لیتی ہے (۳۴)  
پروفیسر مہر اختر وہاب ان کے بارے میں کہتے ہیں:

”شخصی اعتبار سے ایہ کی ایک تہذیبی شخصیت تھے، تہذیبی حوالوں کی ایک خوبصورت تفسیر  
تھے، محبت کرنے والے انسان تھے۔ اگرچہ مسلم لیگ کے جلسوں میں باقاعدہ جاتے تھے لیکن ہندوؤں  
سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد چلے جانے والے ہندو دوستوں کو یاد کر کے روتے تھے۔  
بناوٹ اور تصنع سے بالکل پاک تھے، سادگی و بے تکلفی ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ مزاجاً روایت پرست  
تھے، شاعری میں دھیمے لہجے کے شاعروں کو پسند نہ کرتے تھے۔ میر اور ناصر کی شاعری سے زیادہ شغف  
نہ رکھتے تھے، جاندار اسلوب کو پسند کرتے تھے۔ جوش کی تھلید کی نسبت سے تھل کے شاعر شباب کہلاتے  
تھے۔ منطقی اور عقلی رائے دینے کی بجائے زندگی کا جذباتی حوالے سے مطالعہ کرتے تھے۔“ (۳۵)

ڈاکٹر لیاقت علی نیازی جو نسیم ایہ کے داماد ہیں اور بہت عزیز دوست بھی ان کے متعلق اپنے  
غیر مطبوعہ مضمون جو انہوں نے دامن یوسف پر لکھا، میں یوں رقمطراز ہیں:

”حضرت نسیم ایہ کی شاعری ماسوتی نہیں لاہوتی ہے۔ وہ آزاد نضا کے شاعر تھے  
جن کی شاعری میں بے باکی اور رجائیت ہے۔ وہ ہر زر پرست کی نخوت پر ضرب  
کاری لگاتے ہیں۔

یہ دعا مانگو کہ ساری عمر میری مفلسی      انتقامِ نخوت دارا و جم لیتی رہے  
اردو ادب میں یوسف وزلیخا کے قصے پر بے شمار شعرا نے قلم اٹھایا ہے۔ نسیم ایہ  
نے جس انداز میں احسن القصص کو منظوم کیا وہ انداز ہی نرالا ہے۔“ (۳۶)

نسیم ایہ کے ساتھ منائی جانے والی شام کا حوالہ حکیم عبدالجمید راجی نے ایک رسالے کی  
صورت میں جمع کیا ہے۔ اس میں شامل ایک مضمون ”انسان کی تلاش میں“ پروفیسر اثر ترمذی نے تحریر  
کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

”نسیم کی شاعری میں انسان کی تلاش کا جمالیاتی احساس و خیال ذہن کی زرخیز وادیوں سے گزرتا ہوا مرکب جذبات سے پیاس بجھانا ہوائی شکل متعین کرتا ہے تو اس کے ہاں داخلیت اور خارجیت کا حسین توازن جنم لیتا ہے۔ جب وہ اپنے اردگرد پر نظر ڈالتا ہے اور اسے وہ انسان نظر نہیں آتا جس کے لیے اس کی روح روز ازل سے پریشان ہے تو کہہ اٹھتا ہے:

ابھی یزید پرستی کی رسم جاری ہے      ملوکیت کا جنازہ ابھی کہاں نکلا (۳۷)  
انجم ملک ایم اے لکھتے ہیں:

”شعرا کی شخصیت اور اس کے ذہن کی خوشبو ہے۔ نسیم صاحب کی دامن یوسف کی پیٹانی پر ایک شعر نقش ہے۔“

نسیم دستِ زلیخا کی شرم ساری پر      ہنوز دامن یوسف کے تارہنتے ہیں (۳۸)  
شاعر شباب اور بلبل تھل کا خطاب حاصل کرنے والے نسیم یہ کوتا جدار اشعار کا لقب دیا گیا۔ یہ لجن داؤدی رکھنے والا فن کار ۱۹۸۸ء میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ یہ سے کروڑ لعل عیسن ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے، ویگن کو حادثہ پیش آ گیا۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا، اس حادثے میں ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی، پیٹانی پر چوٹ آئی، نشتر ہسپتال میں ۱۵ ایوم تک زیر علاج رہے۔ ابھی ٹانگ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی کہ گردے کی تکلیف شروع ہو گئی۔ بقول ان کی بہلیہ گردے پر بھی چوٹ آئی تھی، شاید اسی لیے وہ چوٹ بعد میں کینسر بن گئی۔

بیماری کے دوران بھی انہوں نے اپنی انا اور خودداری کا بھرم قائم رکھا۔ بیماری کے ایام میں انہیں اکادمی ادبیات کی طرف سے وظیفہ ملنے لگا۔ حادثے کے بعد وہ ملازمت پر دوبارہ نہ جاسکے۔ کوکہ انہیں کینسر کی تشخیص کے بارے میں نہ بتایا گیا لیکن وہ پھر بھی جانتے تھے کہ اب وہ صحت یاب نہ ہو سکیں گے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سفر آخرت اور موت کے متعلق ایسے اشعار کہے جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ حساس شاعر کے وجدان نے اسے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجئے:

روگھنو تاریخ شوی آخری دماں تے ہے      ہمن دعا دا وقت ہے ویلھا داوا نہیں ریہا  
بقول سلیم اختر ندیم یہ ان کا آخری شعر تھا  
سفر آخرت کے متعلق لکھتے ہیں:

کیا تھیا جندڑے کے جو لمبے سفر ویندا پیاں      اوپر اگھر چھوڑ کہ اج اپنے گھر ویندا پیاں  
زندگی تے موت دا کوئی روگھ لگ سکیا نہیں      بے خبر آیا ہیں تے بے خبر ویندا پیاں (۳۹)  
اپنی زندگی میں سفید پوشی کا جو بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ اہل خانہ کے لیے اس کو قائم رکھنا  
مشکل ہو گیا۔ یوں ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۰ کو نسیم نے اس بیماری کے سبب انتقال فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد  
زندگی نے ان کے اہل خانہ کے لیے عرصہ حیات تک کرنا شروع کر دیا۔ یوں اخبارات کی ایک کالمی  
سرخی بننے کے بعد ایک فن کار جو اپنے علاقے کی پہچان تھا، نہ رہا۔ روزنامہ امروز نے ان کی وفات کی  
خبر یوں شائع کی:

”معروف شاعر نسیم نے طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ میں  
ادبی، سماجی اور سیاسی مکتبہ فکر کے سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ مرحوم کو ان کے  
آبائی قبرستان شیخ جلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ قلعہ خوانی ۲۸ اکتوبر بروز اتوار  
بوقت ۸ بجے صبح جامع مسجد شمالی میں ادا کی جائے گی۔“ (۴۰)  
یہی کی ادبی زندگی کا سہاگ اجڑ گیا جس کے دم سے ادبی محافل پر پا ہوا کرتی تھیں، گھر والوں  
کو بے آسراء دوستوں کو اداس اور اپنے پیارے شہر پر گھبراہٹ کو ویران کر گیا۔

☆☆☆☆☆

### حوالہ جات

- (۱) مہر اختر وہاب، پروفیسر سے ایک ملاقات، ایہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۷ء
- (۲) برکت اعوان، یادوں کے گلاب، روزنامہ نوائے وقت ملتان، قسط نمبر ۲۲، ستمبر ۱۹۹۸ء، ص-ن
- (۳) جعفر بلوچ، پروفیسر، نسیم نے ایک عظیم شاعر روزنامہ خبریں، ۳۱ اگست ۲۰۰۷ء
- (۴) رانا اعجاز احمد سے ملاقات ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۸ء

- (۵) برکت اعوان، یادوں کے گلاب، روزنامہ نوائے وقت ملتان ۲۲ ستمبر ۱۹۹۸
- (۶) ایضاً
- (۷) نسیم لہیہ، برگ لہریاں، ماشریزم اقبال مظفر گڑھ ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۶
- (۸) راقم کی زینون اختر سے گفتگو
- (۹) راقم کی سلیم اختر ندیم سے گفتگو، بمقام لہیہ بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۷ء
- (۱۰) از بیاض نسیم لہیہ غیر مطبوعہ
- (۱۱) راقم کی ملاقات زینون اختر زوجہ نسیم لہیہ، ریلوے ریٹ ہاؤس لہیہ بوقت ۱۲ بجے دن، ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء
- (۱۲) جعفر بلوچ، پروفیسر نسیم لہیہ..... ایک عظیم شاعر روزنامہ خبریں ملتان ۳۱ اگست ۲۰۰۷ء
- (۱۳) برکت اعوان سے راقم کی ایک ملاقات، اعوان ہاؤس لہیہ رہائش برکت اعوان بتاریخ ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء
- بوقت ۷ بجے شام
- (۱۴) از بیاض نسیم لہیہ غیر مطبوعہ (۱۵) جعفر بلوچ، پروفیسر نسیم لہیہ..... ایک عظیم شاعر
- (۱۶) ڈاکٹر تحسین فراقی سے راقم کا رابطہ بذریعہ ٹیلی فون، ۱۵ ستمبر ۲۰۰۷ء، بروز ہفتہ ۸ بجے شب
- (۱۷) از بیاض نسیم لہیہ غیر مطبوعہ (۱۸) راقم سے گفتگو ۱۵ ستمبر ۲۰۰۷ء
- (۱۹) راقم کا پروفیسر مہر اختر وہاب سے انٹرویو
- (۲۰) نسیم لہیہ، ٹڈویک ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت، ۱۲ اپریل ۱۹۸۹ء، ص-ن
- (۲۱) خیال امر وہوی سے راقم کی ملاقات ڈاکٹر خیال مروہوی کی رہائش گاہ بمقام لہیہ، ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء
- (۲۲) زینون اختر زوجہ نسیم لہیہ سے راقم کی ملاقات کینال ریٹ ہاؤس، ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء
- (۲۳) یادوں کے گلاب، برکت اعوان (۲۴) نسیم لہیہ، دیباچہ برگ لہریاں، ص ۱۰-۱۱
- (۲۵) راقم کی ملاقات زینون اختر سے
- (۲۶) بحوالہ جعفر بلوچ، آیات ادب (تذکرہ شعرا لہیہ و مظفر گڑھ) مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۹۸
- (۲۷) خیال امر وہوی، ڈاکٹر، محاکے، کلاسیک ادب لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۴
- (۲۸) منزل حسین، ڈاکٹر، نسیم لہیہ غیر مطبوعہ مضمون

- (۲۹) از بیاض نسیم لہ، غیر مطبوعہ، مملوکہ زیتون اختر زوجہ نسیم لہ
- (۳۰) نسیم لہ برگ لڑاں، ص ۱۳-۱۴
- (۳۱) خیال امر وہوی، ڈاکٹر، محاکے، کلاسیک ادب لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳
- (۳۲) احسان دانش، جہان دیگر حصہ دوم، خزانہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۳۵
- (۳۳) عطاء الحق قاسمی، کالم (وزن دیوار سے) روزنامہ نوائے وقت، ۲۷ مارچ ۱۹۹۶ء
- (۳۴) تاثرات جاوید احسن غیر مطبوعہ
- (۳۵) مہر اختر وہاب، پروفیسر سے ایک انٹرویو، بمقام لہ، ۲۸ نومبر ۲۰۰۷ء
- (۳۶) لیاقت علی نیازی، ڈاکٹر، دامن یوسف غیر مطبوعہ
- (۳۷) عبدالمجید راجی، حکیم، سید، نسیم لہ کے ساتھ ایک یادگار شام، ڈسٹرکٹ پریس کلب، جاوید پرنٹنگ پریس مظفر گڑھ، ص ۹
- (۳۸) مضمون، انجم ملک - ایم - اے - ایضاً، ص ۱۱
- (۳۹) راقم کی سلیم اختر ندیم سے گفتگو بمقام لہ، تاریخ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۷ء
- (۴۰) روزنامہ امروز ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء

